

تَفْہِیْمُ الْقُرْآنِ

حم السجده

(۳۱)

حَمَّ السَّجْدَةِ

نام اس سورت کا نام دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک حم، دوسرے السجدہ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس کا آغاز حم سے ہوتا ہے اور جس میں ایک مقام پر آیت سجدہ آئی ہے۔

زمانہ نزول معتبر روایات کی رو سے اس کا زمانہ نزول حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے کے بعد اور حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے پہلے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاقؒ نے مشہور تابعی محمد بن کعب القرظیؒ کے حوالے سے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا شریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر عتبہ بن ربیعہ (ابوسفیان کے خسر) نے سرداران قریش سے کہا کہ صاحبو! اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں، شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں، اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عتبہ اٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے کہا: ”بھتیجے! تم اپنی قوم میں اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہو وہ تمہیں معلوم ہے۔ مگر تم اپنی قوم پر ایک بڑی مصیبت لے آئے ہو۔ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا، ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا، قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی اور ایسی باتیں کرنے لگے جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ اب ذرا میری بات سنو! میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں، ان پر غور کرو، شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ابوالولید! آپ کہیں، میں سنوں گا۔“ اس نے کہا: ”بھتیجے! یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمہارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطبا بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔“ عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ”ابوالولید! آپ کو جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے؟“ اس نے کہا: ”ہاں۔“ آپؐ نے فرمایا: ”اچھا، اب میری سنو۔“ اس کے بعد آپؐ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اسی سورت کی

تلاوت شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت نمبر ۳۸) پر پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: ”اے ابوالولید! میرا جواب آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔“ عتبہ اٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دُور سے اس کو دیکھتے ہی کہا: خدا کی قسم! عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا: ”کیا سن آئے؟“ اس نے کہا: ”بخدا! میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم! نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے، نہ کہانت۔ اے سردارانِ قریش! میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی، اور اس کی عزت تمہاری عزت ہی ہوگی۔“ سردارانِ قریش اُس کی یہ بات سنتے ہی بول اُٹھے: ”ولید کے ابا! آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔“ عتبہ نے کہا: ”میری جو رائے تھی وہ میں نے تمہیں بتادی، اب تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو۔“ (ابن ہشام، جلد ۱، ص ۳۱۳-۳۱۴)

اس قصے کو متعدد دوسرے محدثین نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے بھی مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جن میں تھوڑا بہت لفظی اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضور تلاوت کرتے ہوئے آیت **فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ** (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں) پر پہنچے تو عتبہ نے بے اختیار آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا: ”خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔“ بعد میں اس نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنے اس فعل کی وجہ یہ بیان کی کہ ”آپ لوگ جانتے ہیں، محمد کی زبان سے جو بات نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے، اس لیے میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔“ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۹۰-۹۱۔ البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۶۲)

موضوع اور مضمون

عتبہ کی اس گفتگو کے جواب میں جو تقریر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، اس میں ان بے ہودہ باتوں کی طرف سرے سے کوئی التفات نہ کیا گیا جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھیں۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ دراصل حضور کی نیت اور آپ کی عقل پر حملہ تھا۔ اُس کی ساری باتوں کے پیچھے یہ مفروضہ کام کر رہا تھا کہ حضور کے نبی، اور قرآن کے وحی ہونے کا تو بہر حال کوئی امکان نہیں ہے، اب لامحالہ آپ کی اس دعوت کا محرک یا تو مال و دولت اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ ہے، یا پھر، معاذ اللہ! آپ کی عقل میں فتور آ گیا ہے۔ پہلی صورت میں وہ آپ سے سودے بازی کرنا چاہتا تھا،

اور دوسری صورت میں یہ کہہ کر آپ کی توہین کر رہا تھا کہ ہم اپنے خرچ پر آپ کی دیوانگی کا علاج کرائے دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی بے ہودگیوں پر جب مخالفین اتر آئیں تو ایک شریف آدمی کا کام ان کا جواب دینا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اُن کو قطعی نظر انداز کر کے اپنی جو بات کہنی ہو کہے۔

عُتْبَةَ کی باتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اس سورہ میں اُس مخالفت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو قرآن مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے کفارِ مکہ کی طرف سے اُس وقت انتہائی ہٹ دھرمی اور بد اخلاقی کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے: ”آپ خواہ کچھ کریں، ہم آپ کی کوئی بات سن کر نہ دیں گے۔ ہم نے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں۔ اپنے کان بند کر لیے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی ہے جو ہمیں اور آپ کو کبھی نہ ملنے دے گی۔“

انہوں نے آپ کو صاف صاف نوٹس دے دیا تھا کہ آپ اپنی اس دعوت کا کام جاری رکھیے، ہم آپ کی مخالفت میں جو کچھ ہم سے ہو سکے گا، کریں گے۔

انہوں نے آپ کو زک دینے کے لیے کام کا یہ نقشہ بنایا تھا کہ جب بھی آپ یا آپ کے پیروؤں میں سے کوئی عام لوگوں کو قرآن سنانے کی کوشش کرے، فوراً ہنگامہ برپا کر دیا جائے اور اتنا شور مچایا جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔

وہ پوری سرگرمی کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے تھے کہ قرآن مجید کی آیات کو الٹے معنی پہننا کر عوام میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانیں۔ بات کچھ کہی جاتی تھی اور وہ اسے بناتے کچھ تھے۔ سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالتے تھے۔ سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی لفظ کہیں سے اور کوئی فقرہ کہیں سے لے اڑتے اور اس کے ساتھ اپنی طرف سے چار باتیں ملا کر نئے نئے مضامین پیدا کرتے تھے، تاکہ قرآن اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے متعلق لوگوں کی رائے خراب کی جائے۔

عجیب عجیب قسم کے اعتراضات جڑتے تھے، جن کا ایک نمونہ اس سورہ میں پیش کیا گیا ہے۔ کہتے تھے کہ ایک عرب اگر عربی زبان میں کوئی کلام سناتا ہے تو اس میں معجزے کی کیا بات ہوئی؟ عربی تو اس کی مادری زبان ہے۔ اپنی مادری زبان میں جس کا جی چاہے ایک کلام تصنیف کر لے اور دعویٰ کر دے کہ وہ اس پر خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ معجزہ تو جب ہوتا کہ یہ شخص کسی دوسری زبان میں، جسے یہ نہیں جانتا، یکایک اُٹھ کر ایک فصیح و بلیغ تقریر کر ڈالتا۔ تب یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ یہ اس کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ اوپر کہیں سے اس پر نازل ہو رہا ہے۔

اس اندھی اور بہری مخالفت کے جواب میں جو کچھ فرمایا گیا ہے، اُس کا ماحصل یہ ہے:

(۱) یہ خدا ہی کا نازل کردہ کلام ہے اور عربی زبان ہی میں ہے۔ جو حقیقتیں اس میں صاف صاف کھول کر بیان کی گئی ہیں، جاہل لوگ اُن کے اندر علم کی کوئی روشنی نہیں پاتے، مگر سمجھ بوجھ رکھنے والے اس روشنی کو دیکھ

بھی رہے ہیں اور اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ یہ تو خدا کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے یہ کلام نازل کیا۔ کوئی اسے زحمت سمجھتا ہے تو یہ اس کی اپنی بد نصیبی ہے۔ خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے فائدہ اٹھائیں، اور ڈرنا چاہیے ان لوگوں کو جو اس سے منہ موڑ لیں۔

(۲) تم نے اگر اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لیے ہیں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہیں تو نبی کے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو نہیں سننا چاہتا اسے سنائے، اور جو نہیں سمجھنا چاہتا اس کے دل میں زبردستی اپنی بات اتارے۔ وہ تو تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ سننے والوں ہی کو سنا سکتا ہے اور سمجھنے والوں ہی کو سمجھا سکتا ہے۔

(۳) تم چاہے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لو اور اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو، مگر حقیقت یہی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی ہے اور تم کسی دوسرے کے بندے نہیں ہو۔ تمہاری ضد سے یہ حقیقت بہر حال نہیں بدل سکتی۔ مان لو گے اور اس کے مطابق اپنا عمل درست کر لو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ نہ مانو گے تو خود ہی تباہی سے دوچار ہو گے۔

(۴) تمہیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ شرک اور کفر تم کس کے ساتھ کر رہے ہو؟ اُس خدا کے ساتھ جس نے یہ آتھاء کائنات بنائی ہے، جو زمین و آسمان کا خالق ہے، جس کی پیدا کی ہوئی برکتوں سے اس زمین میں تم فائدہ اٹھا رہے ہو، اور جس کے مہیا کیے ہوئے رزق پر تم پل رہے ہو۔ اُس کا شریک تم اُس کی حقیر مخلوقات کو بناتے ہو، اور سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ضد میں آ کر منہ موڑتے ہو۔

(۵) اچھا، نہیں مانتے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم پر اسی طرح کا عذاب اچانک ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہے جیسا عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ اور یہ عذاب بھی تمہارے جرم کی آخری سزا نہ ہوگا، بلکہ آگے میدانِ حشر کی باز پرس اور جہنم کی آگ ہے۔

(۶) بڑا ہی بد قسمت ہے وہ انسان جس کے ساتھ ایسے شیاطین جن و انس لگ جائیں جو اُسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھاتے رہیں، اس کی حماقتوں کو اُس کے سامنے خوش نما بنا کر پیش کریں، اور اسے کبھی نہ خود صحیح بات سوچنے دیں، نہ کسی دوسرے سے سننے دیں۔ اس طرح کے نادان لوگ آج تو یہاں ایک دوسرے کو بڑھاوے چڑھاوے دے رہے ہیں، اور ہر ایک دوسرے کی شہ پا کر نہلے پر دہلا مار رہا ہے، مگر قیامت کے روز جب شامت آئے گی تو ان میں سے ہر ایک کہے گا کہ جن لوگوں نے مجھے بہکایا تھا، وہ میرے ہاتھ لگ جائیں تو انھیں پاؤں تلے روند ڈالوں۔

(۷) یہ قرآن ایک اٹل کتاب ہے۔ اسے تم اپنی گھٹیا چالوں اور اپنے جھوٹ کے ہتھیاروں سے شکست نہیں دے سکتے۔ باطل خواہ سامنے سے آئے یا در پردہ اور بالواسطہ حملہ آور ہو، اسے رُک دینے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا۔

(۸) آج تمہاری اپنی زبان میں یہ قرآن پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تم اسے سمجھ سکو، تو تم کہتے ہو کہ یہ کسی عجیبی زبان میں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ہم تمہاری ہدایت کے لیے عجیبی زبان میں اسے بھیجتے تو تم ہی لوگ کہتے کہ یہ بھی عجیب مذاق ہے، عرب کی قوم کی ہدایت کے لیے عجیبی زبان میں کلام فرمایا جا رہا ہے، جسے یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں دراصل ہدایت مطلوب ہی نہیں ہے۔ نہ ماننے کے لیے نت نئے بہانے تراش رہے ہو۔

(۹) کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر فی الواقع حقیقت یہی نکلی کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے ہے تو اس کا انکار کر کے اور اس کی مخالفت میں اتنی دُور تک جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے۔

(۱۰) آج تم نہیں مان رہے ہو، مگر عنقریب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام آفاق پر چھا گئی ہے اور تم خود اس سے مغلوب ہو چکے ہو۔ اُس وقت تمہیں پتا چل جائے گا کہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا تھا، وہ حق تھا۔

مخالفین کو یہ جوابات دینے کے ساتھ اُن مسائل کی طرف بھی توجہ فرمائی گئی ہے جو اس شدید مُزاحمت کے ماحول میں اہل ایمان کو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھے۔ ایمان لانے والوں کے لیے اُس وقت تبلیغ کرنا تو درکنار، ایمان کے راستے پر قائم رہنا بھی سخت دشوار ہو رہا تھا، اور ہر اُس شخص کی جان عذاب میں آجاتی تھی جس کے متعلق یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ دشمنوں کی خوفناک جھتا بندی اور ہر طرف چھائی ہوئی طاقت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ اس حالت میں اول تو یہ کہہ کر اُن کی ہمت بندھائی گئی کہ تم حقیقت میں بے یار و مددگار نہیں ہو، بلکہ جو شخص بھی ایک دفعہ خدا کو اپنا رب مان کر اس عقیدے اور مسلک پر مضبوطی کے ساتھ جم جاتا ہے، خدا کے فرشتے اس پر نازل ہوتے ہیں اور دنیا سے لے کر آخرت تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ پھر یہ فرما کر ان کا حوصلہ بڑھایا گیا کہ بہترین ہے وہ انسان جو خود نیک عمل کرے، دوسروں کو خدا کی طرف بلائے، اور ڈٹ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُس وقت جو سوال سخت پریشان کن بنا ہوا تھا، وہ یہ تھا کہ جب اس دعوت کی راہ میں ایسے سنگِ گراں حائل ہیں تو ان چٹانوں سے تبلیغ کا راستہ آخر کیسے نکالا جائے؟ اس سوال کا حل آپ کو یہ بتایا گیا کہ یہ نمائشی چٹانیں بظاہر بڑی سخت نظر آتی ہیں، مگر اخلاقِ حسنہ کا ہتھیار وہ ہتھیار ہے جو انھیں توڑ کر اور پگھلا کر رکھ دے گا۔ صبر کے ساتھ اس سے کام لو، اور جب کبھی شیطان اشتعال دلا کر کسی دوسرے ہتھیار سے کام لینے پر اُکسائے تو خدا سے پناہ مانگو۔

۲
رکوعاتها۵۲
آیتها

سُورَةُ حَمِ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَمَّ ۱ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۲ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ
اٰیٰتُهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۳ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۴

حَمَّ، یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔

۱ - یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے۔ آگے کی تقریر پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس تمہید میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں وہ بعد کے مضمون سے کیا مناسبت رکھتی ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ یعنی تم جب تک چاہو یہ رٹ لگاتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نزول خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ مزید برآں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اس کلام کو سن کر چیں بہ جبین ہوتے ہو تو تمہارا یہ غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے رد کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات رد کرتے ہو، اور اگر اس سے بے رُخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان (رحمن اور رحیم) ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے صفتِ رحمت کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اُس نے اپنی رحیمی کے اقتضا سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اس سے مخاطبین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اس کلام سے اگر کوئی بے رُخی برتتا ہے، یا اسے رد کرتا ہے، یا اس پر چیں بہ جبین ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح و سعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسانوں سے بے رُخی برتتا تو انہیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروا نہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں، لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

فَاعْرَضَ أَكْثَرَهُمْ فَهَمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۴﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي
 أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَ

مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رُوگردانی کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں: ”جس چیز کی طرف
 تُوہمیں بلارہا ہے، اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں، اور ہمارے

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ یعنی اس میں کوئی بات گُجھک
 اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر دے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے
 مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط
 عقائد کون سے، اچھے اخلاق کیا ہیں اور بُرے اخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی
 بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اُس کا اپنا خسارہ ہے۔ ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص رد کرتا
 ہے یا اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کے اس رویے کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود
 برسرِ غلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو
 اہل عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اُس زبان ہی سے نابلد ہیں جس میں خدا نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔ لیکن یہ تو ان
 کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانہ وہ نہیں بنا سکتے۔ (اس مقام پر آیت ۴۴ بھی پیش نظر رہے جس میں یہی
 مضمون ایک دوسرے طریقے سے بیان ہوا ہے۔ اور یہ شبہ کہ پھر غیر اہل عرب کے لیے تو قرآن کی دعوت کو قبول نہ کرنے
 کے لیے ایک معقول عذر موجود ہے، اس سے پہلے ہم رفع کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یوسف، حاشیہ
 ۵۔ رسائل و مسائل، حصہ اول، ص ۱۹ تا ۲۳)

پانچویں بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں۔ یعنی اس سے فائدہ صرف دانا
 لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ نادان لوگوں کے لیے یہ اسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اُس شخص کے لیے
 بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈر دینے والی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض
 ایک تخیل، ایک فلسفہ، اور ایک نمونہ انشا پیش کرتی ہو، جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو۔ بلکہ یہ ہانکے پکارے تمام
 دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شان دار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو
 صرف ایک بے وقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔

۲۔ یعنی اُس کے لیے ہمارے دلوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔

بَيْنَكَ حِجَابٌ فَأَعْبُدْ إِنَّا عَابِدُونَ ۝ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَىٰ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ فَاستَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوا ۝^ط
 وَوَيْلٌ لِّلشُّرَكِيَّيْنَ ۝^٦ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ
 بِالْآخِرَةِ هُمْ كٰفِرُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔“
 اے نبی! ان سے کہو: میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا
 خدا تو بس ایک ہی خدا ہے، لہذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ بتا ہی ہے ان مشرکوں
 کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے،

۳ - یعنی اس دعوت نے ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ اس نے ہمیں اور تمہیں ایک
 دوسرے سے کاٹ دیا ہے۔ یہ ایک ایسی رکاوٹ بن گئی ہے جو ہم کو اور تم کو جمع نہیں ہونے دیتی۔
 ۴ - اس کے دو مطلب ہیں: ایک، یہ کہ ہم کو تم سے اور تم کو ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرے، یہ کہ تم اپنی
 دعوت سے باز نہیں آتے تو اپنا کام کیے جاؤ، ہم بھی تمہاری مخالفت سے باز نہ آئیں گے، اور جو کچھ تمہیں نچا دکھانے کے
 لیے ہم سے ہو سکے گا، کریں گے۔

۵ - یعنی میرے بس میں یہ نہیں ہے کہ تمہارے دلوں پر چڑھے ہوئے غلاف اتار دوں، تمہارے بہرے کان کھول
 دوں، اور اُس حجاب کو پھاڑ دوں جو تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان ڈال لیا ہے۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ اسی کو سمجھا
 سکتا ہوں جو سمجھنے کے لیے تیار ہو، اسی کو سنا سکتا ہوں جو سننے کے لیے تیار ہو، اور اسی سے مل سکتا ہوں جو ملنے کے لیے تیار ہو۔
 ۶ - یعنی تم چاہے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو اور اپنے کان بہرے کر لو، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہارے بہت
 سے خدا نہیں ہیں، بلکہ صرف ایک ہی خدا ہے جس کے تم بندے ہو۔ اور یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے جو میں نے اپنے غور و فکر سے
 بنایا ہو، جس کے صحیح اور غلط ہونے کا یکساں احتمال ہو، بلکہ یہ حقیقت مجھ پر وحی کے ذریعے سے منکشف کی گئی ہے جس میں
 غلطی کے احتمال کا شائبہ تک نہیں ہے۔

۷ - یعنی کسی اور کو خدا نہ بناؤ، کسی اور کی بندگی و پرستش نہ کرو، کسی اور کو مدد کے لیے نہ پکارو، کسی اور کے آگے
 سر تسلیم و اطاعت خم نہ کرو، کسی اور کے رسم و رواج اور قانون و ضابطہ کو شریعت و واجب الطاعت نہ مانو۔
 ۸ - معافی اُس بے وفائی کی جو اب تک تم اپنے خدا سے کرتے رہے، اُس شرک اور کفر اور نافرمانی کی جس کا ارتکاب



لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۙ قُلْ أَيْنَكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ
الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا ۗ ذَٰلِكَ رَبُّ
الْعَالَمِينَ ۙ وَجَعَلَ فِيهَا رِوَاْسِي مِّنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا
وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۖ سَوَاءً لِّلسَّالِئِينَ ۙ

اُن کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔
اے نبی! ان سے کہو: کیا تم اُس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اُس کا ہمسر
ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔
اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اُوپر سے اس پر پہاڑ جمادیے، اور اس میں
برکتیں رکھ دیں، اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت
کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں^{۱۳} ہو گئے۔

تم سے اب تک ہوتا رہا، اور ان گناہوں کی جو خدا فراموشی کے باعث تم سے سرزد ہوئے۔

۹ - یہاں زکوٰۃ کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ اور ان کے جلیل القدر شاگرد
عکرمہؓ اور مجاہدؓ کہتے ہیں کہ اس مقام پر زکوٰۃ سے مراد وہ پاکیزگی نفس ہے جو توحید کے عقیدے اور اللہ کی اطاعت سے
حاصل ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تباہی ہے ان مشرکین کے لیے جو پاکیزگی اختیار نہیں
کرتے۔ دوسرا گروہ، جس میں قتادہؓ، سدیؓ، حسن بصریؓ، ضحاکؓ، مقاتلؓ اور ابن السائبؓ جیسے مفسرین شامل ہیں، اس
لفظ کو یہاں بھی زکوٰۃ مال ہی کے معنی میں لیتا ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ تباہی ہے اُن لوگوں
کے لیے جو شرک کر کے خدا کا اور زکوٰۃ نہ دے کر بندوں کا حق مارتے ہیں۔

۱۰ - اصل میں أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے دو معنی اور بھی ہیں: ایک، یہ کہ وہ
ایسا اجر ہوگا جس میں کبھی کمی نہ آئے گی۔ دوسرے یہ کہ وہ اجر احسان جتنا جتنا نہیں دیا جائے گا، جیسے کسی بخیل کا عطیہ ہوتا
ہے کہ اگر وہ جی کڑا کر کے کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو بار بار اس کو جتنا ہے۔

۱۱ - زمین کی برکتوں سے مراد وہ بے حد و حساب سر و سامان ہے جو کروڑ ہا کروڑ سال سے مسلسل اُس کے پیٹ سے نکلتا
چلا آ رہا ہے اور خرد بینی کیڑوں سے لے کر انسان کے بلند ترین تمدن تک کی روز افزوں ضروریات پوری کیے چلا جا رہا ہے۔ ان
برکتوں میں سب سے بڑی برکتیں ہوا اور پانی ہیں، جن کی بدولت ہی زمین پر نباتی، حیوانی اور پھر انسانی زندگی ممکن ہوئی۔

۱۲ - اصل الفاظ ہیں: قَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ ۖ سَوَاءً لِّلسَّالِئِينَ۔ اس فقرے کی تفسیر میں
مفسرین کے متعدد اقوال ہیں:

بعض مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”زمین میں اس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے ٹھیک حساب سے رکھ دیے پورے چار دنوں میں۔“ یعنی کم یا زیادہ نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں۔

ابن عباسؓ، قتادہؓ اور سیدیؓ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ”زمین میں اس کے ارزاق چار دنوں میں رکھ دیے۔ پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا۔“ یعنی جو کوئی یہ پوچھے کہ یہ کام کتنے دنوں میں ہوا، اُس کا مکمل جواب یہ ہے کہ چار دنوں میں ہو گیا۔

ابن زیدؓ اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ ”زمین میں اُس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے چار دنوں کے اندر رکھ دیے، ٹھیک اندازے سے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق۔“

جہاں تک قواعد زبان کا تعلق ہے، آیت کے الفاظ میں یہ تینوں معنی لینے کی گنجائش ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلے دو معنوں میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ موقع محل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیا اہمیت رکھتی ہے کہ یہ کام ایک گھنٹا کم چار دن، یا ایک گھنٹا زیادہ چار دن میں نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور کمال رُبوبیت اور کمال حکمت کے بیان میں کون سی کسر رہ جاتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے اس تصریح کی حاجت ہو؟ اسی طرح یہ تفسیر بھی بڑی کمزور تفسیر ہے کہ ”پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا۔“ آیت سے پہلے اور بعد کے مضمون میں کسی جگہ بھی کوئی قرینہ یہ نہیں بتاتا کہ اُس وقت کسی سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ سارے کام کتنے دنوں میں ہوئے، اور یہ آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی۔ انھی وجوہ سے ہم نے ترجمے میں تیسرے معنی کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زمین میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک جس جس قسم کی جتنی مخلوق بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا تھا، ہر ایک کی مانگ اور حاجت کے ٹھیک مطابق غذا کا پورا سامان حساب لگا کر اس نے زمین کے اندر رکھ دیا۔ نباتات کی بے شمار اقسام خشکی اور تری میں پائی جاتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی غذائی ضروریات دوسری اقسام سے مختلف ہیں۔ جاندار مخلوقات کی بے شمار انواع ہو اور خشکی اور تری میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور ہر نوع ایک الگ قسم کی غذا مانگتی ہے۔ پھر ان سب سے جدا، ایک اور مخلوق انسان ہے جس کو محض جسم کی پرورش ہی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بھی طرح طرح کی خوراکیں درکار ہیں۔ اللہ کے سوا کون جان سکتا تھا کہ اس کُرۃ خاکی پر زندگی کا آغاز ہونے سے لے کر اُس کے اختتام تک کس کس قسم کی مخلوقات کے کتنے افراد کہاں کہاں اور کب کب وجود میں آئیں گے، اور ان کو پالنے کے لیے کیسی اور کتنی غذا درکار ہوگی۔ اپنی تخلیقی اسکیم میں جس طرح اُس نے غذا طلب کرنے والی ان مخلوقات کو پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اسی طرح اُس نے ان کی طلب کو پورا کرنے کے لیے خوراک کا بھی مکمل انتظام کر دیا۔

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصور اشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن ”قرآنی نظام رُبوبیت“ کے نام سے نکالا ہے، وہ سَوَاءَ لِّلْسَاءِیْلِیْنَ کا ترجمہ ”سب مانگنے والوں کے لیے برابر“ کرتے ہیں، اور اس پر استدلال کی عمارت یوں اٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لیے برابر خوراک رکھی ہے، لہذا آیت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے، کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مساوات قائم نہیں ہو سکتی جس کا یہ ”قرآنی قانون“ تقاضا کر رہا ہے۔ لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سالکین، جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، صرف انسان ہی نہیں ہیں، بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنہیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا واقعی

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وِلْدَانَ لِرِضٍ

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دُھواں تھا۔ اُس نے آسمان اور زمین سے کہا: ”وجود

ان سب کے درمیان، یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان خدا نے سامان پرورش میں مساوات رکھی ہے؟ کیا فطرت کے اس پورے نظام میں کہیں آپ کو غذا کے مساوی راشن کی تقسیم کا انتظام نظر آتا ہے؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں، جہاں انسانی ریاست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ریاست براہ راست تقسیم رزق کا انتظام کر رہی ہے، اللہ میاں خود اپنے اس ”قرآنی قانون“ کی خلاف ورزی۔۔۔ بلکہ معاذ اللہ! بے انصافی۔۔۔ فرما رہے ہیں! پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ ”سائلین“ میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں جنہیں انسان پالتا ہے، اور جن کی خوراک کا انتظام انسان ہی کے ذمے ہے۔ مثلاً بھیڑ بکری، گائے بھینس، گھوڑے، گدھے، نچر اور اونٹ وغیرہ۔ اگر قرآنی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے، اور اسی قانون کو نافذ کرنے کے لیے نظام رُبو بیت چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے، تو کیا وہ ریاست انسان اور ان حیوانات کے درمیان بھی معاشی مساوات قائم کرے گی؟

۱۳۔ اس مقام کی تفسیر میں مفسرین کو بالعموم یہ زحمت پیش آئی ہے کہ اگر زمین کی تخلیق کے دو دن، اور اس میں پہاڑ جمانے اور برکتیں رکھنے اور سامان خوراک پیدا کرنے کے چار دن تسلیم کیے جائیں، تو آگے آسمانوں کی پیدائش دو دنوں میں ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مزید دو دن ملا کر آٹھ دن بن جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر قرآن مجید میں تصریح فرمائی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق جملہ چھ دنوں میں ہوئی ہے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۶-۲۶۱-۳۲۳۔ جلد سوم، ص ۴۶۰) اسی بنا پر قریب قریب تمام مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ چار دن زمین کی تخلیق کے دو دن سمیت ہیں، یعنی دو دن تخلیق زمین کے اور دو دن زمین کے اندر ان باقی چیزوں کی پیدائش کے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس طرح جملہ چار دنوں میں زمین اپنے سر و سامان سمیت مکمل ہو گئی۔ لیکن یہ بات قرآن مجید کے ظاہر الفاظ کے بھی خلاف ہے، اور درحقیقت وہ زحمت بھی محض خیالی زحمت ہے جس سے بچنے کے لیے اس تاویل کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ زمین کی تخلیق کے دو دن دراصل اُن دو دنوں سے الگ نہیں ہیں جن میں بحیثیت مجموعی پوری کائنات بنی ہے۔ آگے کی آیات پر غور کیجیے۔ ان میں زمین اور آسمان دونوں کی تخلیق کا یکجا ذکر کیا گیا ہے، اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیے۔ ان سات آسمانوں سے پوری کائنات مراد ہے، جس کا ایک جُز ہماری یہ زمین بھی ہے۔ پھر جب کائنات کے دوسرے بے شمار تاروں اور سیاروں کی طرح یہ زمین بھی اُن دو دنوں کے اندر مُجرّد ایک کُرے کی شکل اختیار کر چکی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ذی حیات مخلوقات کے لیے تیار کرنا شروع کیا، اور چار دنوں کے اندر اس میں وہ سب کچھ سر و سامان پیدا کر دیا جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے تاروں اور سیاروں میں ان چار دنوں کے اندر کیا کچھ ترقیاتی کام کیے گئے، اُن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے، کیونکہ نزول قرآن کے دور کا انسان تو درکنار، اس زمانے کا آدمی بھی ان معلومات کو ہضم کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

۱۴۔ اس مقام پر تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

اَتَّبِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَّيْنَا طَاعِیْنًا ۝ فَقَضٰهُنَّ

میں آ جاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔“ دونوں نے کہا: ”ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح۔“ تب اُس نے

اول، یہ کہ آسمان سے مراد یہاں پوری کائنات ہے، جیسا کہ بعد کے فقروں سے ظاہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسمان کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات کی طرف متوجہ ہوا۔

دوم، یہ کہ دھوئیں سے مراد مادّے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گرمی سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزا غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانے کے سائنس داں اسی چیز کو سحابیے (nebula) سے تعبیر کرتے ہیں اور آغاز کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادّہ جس سے کائنات بنی ہے، اسی دُخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا۔

سوم، یہ کہ ”پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا“ سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ پہلے اُس نے زمین بنائی، پھر اس میں پہاڑ جمانے، برکتیں رکھنے اور سامانِ خوراک فراہم کرنے کا کام انجام دیا، پھر اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ کائنات کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا۔ اس غلط فہمی کو بعد کا یہ فقرہ رفع کر دیتا ہے کہ ”اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آ جاؤ، اور انھوں نے کہا: ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح۔“ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت اور بعد کی آیات میں ذکر اُس وقت کا ہو رہا ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان تھا، بلکہ تخلیق کائنات کی ابتدا کی جا رہی تھی۔ محض لفظ ھَمَّ (پھر) کو اس بات کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا کہ زمین کی پیدائش آسمان سے پہلے ہو چکی تھی۔ قرآن مجید میں اس امر کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ھَمَّ کا لفظ لازماً ترتیبِ زمانی ہی کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ ترتیبِ بیان کے طور پر بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورہ زمر، حاشیہ نمبر ۱۲)

قدیم زمانے کے مفسرین میں یہ بحث مدت ہائے دراز تک چلتی رہی ہے کہ قرآن مجید کی رُو سے زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ ایک گروہ اس آیت اور سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ سے یہ استدلال کرتا ہے کہ زمین پہلے بنی ہے۔ دوسرا گروہ سورہ نازعات کی آیات ۲۷ تا ۳۳ سے دلیل لاتا ہے کہ آسمان پہلے بنا ہے، کیونکہ وہاں اس امر کی تصریح ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی تخلیق کائنات کا ذکر طبیعیات یا ہیئت کے علوم سکھانے کے لیے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ توحید و آخرت کے عقائد پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے بے شمار دوسرے آثار کی طرح زمین و آسمان کی پیدائش کو بھی غور و فکر کے لیے پیش فرمایا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ بات سرے سے غیر ضروری تھی کہ تخلیق آسمان و زمین کی زمانی ترتیب بیان کی جاتی اور بتایا جاتا کہ زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ دونوں میں سے خواہ یہ پہلے بنی ہو یا وہ، بہر حال دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے الٰہ واحد ہونے پر گواہ ہیں، اور اس امر پر شاہد ہیں کہ ان کے پیدا کرنے والے نے یہ سارا کارخانہ کسی کھلنڈرے کے کھلونے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اسی لیے قرآن کسی جگہ زمین کی پیدائش کا ذکر پہلے کرتا ہے اور کسی جگہ آسمان کی پیدائش کا۔ جہاں انسان کو خدا کی نعمتوں کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ زمین کا ذکر پہلے کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان سے قریب تر ہے۔ اور جہاں خدا کی عظمت اور اس کے کمالِ قدرت کا تصور دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ آسمانوں کا ذکر پہلے کرتا ہے،

سَبْعَ سَبَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَبَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيْنًا
السَّاءَ الدُّنْيَا بِصَاحِبِهَا وَحِفْظًا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۱۲﴾

دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے، اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمانِ دنیا کو ہم نے
چرانگوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔

کیونکہ چرخِ گرداں کا منظر ہمیشہ سے انسان کے دل پر بہت طاری کرتا رہا ہے۔

۱۵ - ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے طریقِ تخلیق کی کیفیت ایسے انداز سے بیان فرمائی ہے جس سے خدائی
تخلیق اور انسانی صنّاعی کا فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ انسان جب کوئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ اپنے ذہن میں
جماتا ہے، پھر اُس کے لیے مطلوبہ مواد جمع کرتا ہے، پھر اس مواد کو اپنے نقشے کے مطابق صورت دینے کے لیے پیہم محنت اور
کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دوران میں وہ مواد، جسے وہ اپنے ذہنی نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے، مسلسل اس کی مزاحمت کرتا
رہتا ہے، یہاں تک کہ کبھی مواد کی مزاحمت کامیاب ہو جاتی ہے اور چیز مطلوبہ نقشے کے مطابق ٹھیک نہیں بنتی، اور کبھی آدمی کی
کوشش غالب آ جاتی ہے اور وہ اسے اپنی مطلوبہ شکل دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک درزی قمیص بنانا
چاہتا ہے۔ اس کے لیے پہلے وہ قمیص کی صورت کا تصور اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے، پھر کپڑا فراہم کر کے اُسے اپنے
تصورِ قمیص کے مطابق تراشنے اور سینے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دوران میں اُسے کپڑے کی اس مزاحمت کا مسلسل
مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ درزی کے تصور پر ڈھلنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، حتیٰ کہ کبھی کپڑے کی مزاحمت غالب آ جاتی
ہے اور قمیص ٹھیک نہیں بنتا، اور کبھی درزی کی کوشش غالب آ جاتی ہے اور وہ کپڑے کو ٹھیک اپنے تصور کے مطابق شکل دے دیتا
ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا طرزِ تخلیق دیکھیے۔ کائنات کا مادہ دھوس کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اللہ نے چاہا کہ اسے وہ شکل دے
جو آبِ کائنات کی ہے۔ اس غرض کے لیے اُسے کسی انسان کا ریگر کی طرح بیٹھ کر زمین اور چاند اور سورج اور دوسرے
تارے اور سیارے گھرنے نہیں پڑے، بلکہ اُس نے کائنات کے اُس نقشے کو جو اس کے ذہن میں تھا بس یہ حکم دے دیا کہ وہ
وجود میں آ جائے، یعنی دھوس کی طرح پھیلا ہوا مواد اُن کہکشائوں اور تاروں اور سیاروں کی شکل میں ڈھل جائے جنہیں وہ
پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس مواد میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ اللہ کے حکم کی مزاحمت کرتا۔ اللہ کو اسے کائنات کی صورت میں ڈھالنے
کے لیے کوئی محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑی۔ ادھر حکم ہوا اور ادھر وہ مواد سکڑا اور سمٹ کر فرماں برداروں کی طرح اپنے مالک
کے نقشے پر ڈھلتا چلا گیا، یہاں تک کہ دونوں میں زمین سمیت ساری کائنات بن کر تیار ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ کے طریقِ تخلیق کی اسی کیفیت کو قرآن مجید میں دوسرے متعدد مقامات پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ
اللہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اول،
البقرہ، حاشیہ ۱۱۵، آل عمران، حواشی ۴۴ - ۵۳، جلد دوم، النحل، حواشی ۳۵ - ۳۶، جلد سوم، مریم، حاشیہ ۲۲ -
جلد چہارم، یسین، آیت ۸۲، المؤمن، آیت ۶۸)

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِثْلَ صَاعِقَةِ
عَادٍ وَثُودٍ ۝ إِذْ جَاءَتْهُمْ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ
وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۗ قَالُوا لَوْ شَاءَ
رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِهَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كِفْرًا ۝

اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا تھا۔ جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، تو انہوں نے کہا: ”ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہذا ہم اُس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔“

۱۶- ان آیات کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن کے حسب ذیل مقامات کا مطالعہ مفید ہوگا: جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۳۴۔ جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲، الحجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۳۴-۳۵، المؤمنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، یسین، حاشیہ ۳۷، الصافات، حواشی ۵-۶۔

۱۷- یعنی اس بات کو نہیں مانتے کہ خدا اور معبود بس وہی ایک ہے جس نے یہ زمین اور ساری کائنات بنائی ہے، اور اپنی اس جہالت پر اصرار ہی کیے چلے جاتے ہیں کہ اُس خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی، جو حقیقت میں اس کے مخلوق و مملوک ہیں، معبود بنائیں گے اور اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں انہیں اُس کا شریک ٹھیرائیں گے۔

۱۸- اس فقرے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ ان کے پاس رسول کے بعد رسول آتے رہے۔ دوسرے، یہ کہ رسولوں نے ہر پہلو سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، اور ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ تیسرے، یہ کہ ان کے پاس اُن کے اپنے ملک میں بھی رسول آئے اور گرد و پیش کے ملکوں میں بھی آتے رہے۔

۱۹- یعنی اگر اللہ کو ہمارا یہ مذہب پسند نہ ہوتا اور وہ اس سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ تم چونکہ فرشتے نہیں ہو بلکہ ہم جیسے انسان ہی ہو، اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے اور اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنا مذہب چھوڑ کر وہ دین اختیار کر لیں جسے تم پیش کر رہے ہو۔ کفار کا یہ کہنا کہ جس چیز کے لیے تم ”بھیجے گئے ہو“ اُسے ہم نہیں مانتے، محض طنز کے طور پر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے اور پھر ان کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بلکہ یہ اسی طرح کا طنز یہ انداز بیان ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کے متعلق اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ ”إِنَّ رَسُولَكُمْ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ“ (الشعراء، آیت ۲۷)، ”یہ رسول صاحب جو تمہارے

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا
 مَنْ أَشَدُّ مَنَاوَةٌ^ط أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ
 أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً^ط وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿٢٠﴾ فَأَرْسَلْنَا
 عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحْسَاتٍ لِنُنذِرَ قَوْمَ عَدَابِ
 الْآخِرَةِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا^ط وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَى

عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے: ”کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔“ اُن کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے، وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے، آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی۔ تاکہ انھیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھادیں، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن

پاس بھیجے گئے ہیں، بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔“ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورہ یسین، حاشیہ نمبر ۱۱)

۲۰۔ ”منحوس دنوں“ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دن بجائے خود منحوس تھے، اور عذاب اس لیے آیا کہ یہ منحوس دن قوم عاد پر آگئے تھے۔ یہ مطلب اگر ہوتا اور بجائے خود اُن دنوں ہی میں کوئی نحوست ہوتی تو عذاب دُور و نزدیک کی ساری ہی قوموں پر آجاتا۔ اس لیے صحیح مطلب یہ ہے کہ اُن ایام میں چونکہ اس قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوا، اس بنا پر وہ دن قوم عاد کے لیے منحوس تھے۔ اس آیت سے دنوں کے سعد و نحس پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

طوفانی ہوا کے لیے ”رِيحٌ صَرْصَرٌ“ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے معنی میں اہل لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت لُو ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت ٹھنڈی ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی ہوا ہے جس کے چلنے سے سخت شور برپا ہوتا ہو۔ بہر حال اس معنی پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ بہت تیز طوفانی ہوا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل آئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ ہوا مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے اور مر مر کر گر پڑے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں۔ (الحاقہ، آیت ۷) جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی، اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ (الذاریات، ۴۲) جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی، اس وقت عاد کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھر کر آئی ہے، بارش ہوگی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے گا۔ مگر وہ آئی تو

وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ ﴿١٦﴾ وَأَمَّا شُرُودٌ فَهَدَيْنَهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَى عَلَى
الْهُدَى فَأَخَذَتْهُمْ صِعْقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿١٧﴾ وَ
نَجَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿١٨﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ
إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَبْعُهُمْ وَ

ہے، وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

رہے شمود، تو ان کے سامنے ہم نے راہِ راست پیش کی، مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا پسند کیا۔ آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا، اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بد عملی سے پرہیز کرتے تھے۔^{۲۲} اور ذرا اُس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا، پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور

اس طرح آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ (الاحقاف: ۲۳-۲۵)

۲۱ - یہ ذلت و رسوائی کا عذاب ان کے اُس کبر و غرور کا جواب تھا جس کی بنا پر وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے تھے اور خم ٹھونک ٹھونک کر کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے۔ اللہ نے ان کو اس طرح ذلیل کیا کہ ان کی آبادی کے بڑے حصے کو ہلاک کر دیا، ان کے تمدن کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا، اور ان کا قلیل حصہ جو باقی رہ گیا وہ دنیا کی اُنھی قوموں کے آگے ذلیل و خوار ہوا جن پر کبھی یہ لوگ اپنا زور جتاتے تھے۔ (عاد کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۱ تا ۵۳، ہود، حواشی ۵۲ تا ۶۶۔ جلد سوم، المؤمنون، حواشی ۳۲ تا ۳۷، الشعراء، حواشی ۸۸ تا ۹۴، العنکبوت، حاشیہ ۶۵)

۲۲ - شمود کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حواشی ۵۷ تا ۵۹، ہود، حواشی ۶۹ تا ۷۲، الحجر، حواشی ۳۲ تا ۳۶، بنی اسرائیل، حاشیہ ۶۸۔ جلد سوم، الشعراء، حواشی ۹۵ تا ۱۰۶، النمل، حواشی ۵۸ تا ۶۶)۔
۲۳ - اصل مدعا یہ کہنا ہے کہ جب وہ اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ لیکن اس مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ کیونکہ ان کا انجام آخر کار دوزخ ہی میں جانا ہے۔

أَبْصَارُهُمْ وَ جُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۰﴾ وَقَالُوا
لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ
الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ

ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے: ”تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟“ وہ جواب دیں گی: ”ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم

۲۴ - یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ ایک ایک نسل اور ایک ایک پشت کا حساب کر کے اس کا فیصلہ یکے بعد دیگرے کیا جاتا رہے، بلکہ تمام اگلی پچھلی نسلیں بیک وقت جمع کی جائیں گی اور ان سب کا اکٹھا حساب کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنی زندگی میں جو کچھ بھی اچھے اور بُرے اعمال کرتا ہے، اس کے اثرات اس کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی مدت ہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں اور وہ ان اثرات کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک نسل اپنے دور میں جو کچھ بھی کرتی ہے، اس کے اثرات بعد کی نسلوں میں صدیوں جاری رہتے ہیں، اور اپنے اس ورثے کے لیے وہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ محاسبے اور انصاف کے لیے ان سارے ہی آثار و نتائج کا جائزہ لینا اور ان کی شہادتیں فراہم کرنا ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے قیامت کے روز نسل پر نسل آتی جائے گی اور ٹھیرائی جاتی رہے گی۔ عدالت کا کام اُس وقت شروع ہوگا جب اگلے پچھلے سب جمع ہو جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)

۲۵ - احادیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ جب کوئی ہیکڑ مجرم اپنے جرائم کا انکار ہی کرتا چلا جائے گا اور تمام شہادتوں کو بھی جھٹلانے پر تُل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے جسم کے اعضا ایک ایک کر کے شہادت دیں گے کہ اُس نے ان سے کیا کیا کام لیے تھے۔ یہ مضمون حضرت انسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اور مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، بزار وغیرہ محدثین نے ان روایات کو نقل کیا ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارم، یسین، حاشیہ ۵۵)

یہ آیت منجملہ ان بہت سی آیات کے ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم آخرت محض ایک روحانی عالم نہیں ہوگا، بلکہ انسان وہاں دوبارہ اسی طرح جسم و روح کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ اب اس دنیا میں ہیں۔ یہی نہیں، اُن کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں۔ وہی تمام اجزا اور جوہر (atoms) جن سے اُن کے بدن اس دنیا میں مرکب تھے، قیامت کے روز جمع کر دیے جائیں گے اور وہ اپنے انہی سابق جسموں کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے جن کے اندر وہ دنیا میں کام کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اعضا وہاں اسی صورت میں تو گواہی دے سکتے ہیں جب کہ وہ وہی اعضا ہوں جن سے اُس نے اپنی پہلی

تَرْجِعُونَ ﴿۲۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۲﴾ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۲۳﴾ فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالنَّارُ

واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمہارا یہی گمان، جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے۔“ اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں)، آگ ہی

زندگی میں کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس مضمون پر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات بھی دلیل قاطع ہیں: بنی اسرائیل، آیات ۲۹ تا ۵۱ - ۹۸ - المومنون: ۳۵ تا ۳۸ - ۸۲ - ۸۳ - النور: ۲۴ - السجدہ، ۱۰ - یسین: ۶۵ - ۷۸ - ۷۹ - الصافات: ۱۶ تا ۱۸ - الواقعة: ۴۷ تا ۵۰ - النازعات: ۱۰ تا ۱۴۔

۲۶ - اس سے معلوم ہوا کہ صرف انسان کے اپنے اعضائے جسم ہی قیامت کے روز گواہی نہیں دیں گے، بلکہ ہر وہ چیز بول اُٹھے گی جس کے سامنے انسان نے کسی فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ یہی بات سورہ زلزال میں فرمائی گئی ہے کہ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا لَبَأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَى لَهَا زَمِينَ وَه سارے بوجھ نکال پھینکے گی جو اس کے اندر بھرے پڑے ہیں، اور انسان کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو گیا ہے، اُس روز زمین اپنی ساری سرگزشت سنا دے گی، (یعنی جو جو کچھ انسان نے اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اس کی ساری داستان بیان کر دے گی)۔ کیونکہ تیرا رب اسے بیان کرنے کا حکم دے چکا ہوگا۔

۲۷ - حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تشریح میں خوب فرمایا ہے کہ ہر آدمی کا رویہ اُس گمان کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے جو وہ اپنے رب کے متعلق قائم کرتا ہے۔ مومن صالح کا رویہ اس لیے درست ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے بارے میں صحیح گمان رکھتا ہے، اور کافر و منافق اور فاسق و ظالم کا رویہ اس لیے غلط ہوتا ہے کہ اپنے رب کے بارے میں اس کا گمان غلط ہوتا ہے۔ یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی جامع اور مختصر حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارا رب کہتا ہے: انا عند ظن عبدی بی، ”میں اُس گمان کے ساتھ ہوں جو میرا بندہ مجھ سے رکھتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

مَثْوَى لَهُمْ ج وَ اِنْ يُسْتَعْتَبُوا فَمَا هُمْ مِنَ الْبُعْتَبِيْنَ ۝۲۴
 وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُّوا لَهُمْ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ
 وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْ اُمَّمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
 قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ج اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۵



ان کا ٹھکانا ہوگی، اور اگر رجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع انھیں نہ دیا جائے گا۔ ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلط کر دیے تھے جو انھیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوش نما بنا کر دکھاتے تھے، آخر کار ان پر بھی وہی فیصلہ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا، یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے۔

۲۸ - اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کی طرف پلٹنا چاہیں گے تو نہ پلٹ سکیں گے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو نہ نکل سکیں گے، اور یہ بھی کہ توبہ اور معذرت کرنا چاہیں گے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

۲۹ - یہ اللہ تعالیٰ کی مستقل اور دائمی سنت ہے کہ وہ بُری نیت اور بُری خواہشات رکھنے والے انسانوں کو کبھی اچھے ساتھی نہیں دلواتا، بلکہ انھیں ان کے اپنے رُجحانات کے مطابق بُرے ساتھی ہی دلواتا ہے۔ پھر جتنے جتنے وہ بدی کی پستیوں میں گہرے اترتے جاتے ہیں، اتنے ہی بدتر سے بدتر آدمی اور شیاطین ان کے ہم نشین اور مشیر اور رفیق کار بنتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ فلاں صاحب بذات خود تو بہت اچھے ہیں، مگر انھیں ساتھی بُرے مل گئے ہیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر شخص کو ویسے ہی دوست ملتے ہیں جیسا وہ خود ہوتا ہے۔ ایک نیک آدمی کے ساتھ اگر بُرے لوگ لگ بھی جائیں تو وہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک لگے نہیں رہ سکتے۔ اور اسی طرح ایک بدنیت اور بد کردار آدمی کے ساتھ نیک اور شریف انسانوں کی رفاقت اتفاقاً واقع ہو بھی جائے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں نبھ سکتی۔ بد آدمی فطرتاً بدوں ہی کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور بد ہی اس کی طرف کھینچتے ہیں، جس طرح غلاظت مکھیوں کو کھینچتی ہے اور مکھیاں غلاظت کی طرف کھینچتی ہیں۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ وہ آگے اور پیچھے ہر چیز ان کو خوش نما بنا کر دکھاتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو یقین دلاتے تھے کہ آپ کا ماضی بھی بڑا شان دار تھا اور مستقبل بھی نہایت درخشاں ہے۔ وہ ایسی عینک ان کی آنکھوں پر چڑھاتے تھے کہ ہر طرف ان کو ہر ہی ہر نظر آتا تھا۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ آپ پر تنقید کرنے والے احمق ہیں، آپ کوئی نرالا کام تھوڑی کر رہے ہیں، دنیا میں ترقی کرنے والے وہی کچھ کرتے رہے ہیں جو آپ کر رہے ہیں، اور آگے اول تو کوئی آخرت ہے ہی نہیں جس میں آپ کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے، لیکن اگر وہ پیش آ ہی گئی، جیسا کہ چند نادان دعویٰ کرتے ہیں، تو جو خدا آپ کو یہاں

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ
تَعْلَبُونَ ﴿۲۶﴾ فَلَنذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ
أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾ ذَلِكَ جَزَاءُ أَعْدَاءِ اللَّهِ النَّارِ ۖ
لَهُمْ فِيهَا دَأْرُ الْخُلْدِ ۖ جَزَاءُ ۖ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۲۸﴾
قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذِينَ أَضَلَّنَا مِنَ الْجِنَّ
وَالْإِنْسِ نَجْعَلُهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ ﴿۲۹﴾

یہ منکرین حق کہتے ہیں: ”اس قرآن کو ہرگز نہ سنو، اور جب یہ سُنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو، شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔“ ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزا چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ انھیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ وہاں یہ کافر کہیں گے کہ ”آے ہمارے رب! ذرا ہمیں دکھا دے اُن جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، ہم انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے، تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں۔“

نعمتوں سے نواز رہا ہے وہ وہاں بھی آپ پر انعام و اکرام کی بارش کرے گا، دوزخ آپ کے لیے نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بنی ہے جنہیں یہاں خدا نے اپنی نعمتوں سے محروم کر رکھا ہے۔

۳۰۔ یہ کفار مکہ کے اُن منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور اس کو سنانے والا کس پاپے کا انسان ہے، اور اس شخصیت کے ساتھ اس کا طرز ادا کس درجہ مؤثر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اس دل کش انداز میں اس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ آخر کار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لیے انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اسے سنانا شروع کریں، شور مچاؤ، تالی پیٹ دو، آوازے کسو، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو، اور اتنی آواز بلند کرو کہ ان کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔ اس تدبیر سے وہ اُمید رکھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ
الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ

جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ”نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے

دے دیں گے۔

۳۱- یعنی دنیا میں تو یہ لوگ اپنے لیڈروں اور پیشواؤں اور فریب دینے والے شیاطین کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، مگر جب قیامت کے روز انہیں پتا چلے گا کہ یہ رہنما انہیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی لوگ انہیں کوٹنے لگیں گے اور یہ چاہیں گے کہ وہ کسی طرح ان کے ہاتھ آجائیں تو پکڑ کر انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں۔

۳۲- یہاں تک کفار کو ان کی ہٹ دھرمی اور مخالفت حق کے نتائج پر متنبہ کرنے کے بعد اب اہل ایمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روئے سخن مڑتا ہے۔

۳۳- یعنی محض اتفاقاً کبھی اللہ کو اپنا رب کہہ کر نہیں رہ گئے، اور نہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا رب کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا رب بناتے بھی جائیں، بلکہ ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے، اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کیا، نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی، اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدہ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔

توحید پر استقامت کا مفہوم کیا ہے، اس کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ نے اس طرح کی ہے:
حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: قد قالها الناس ثم كفر اكثرهم، فمن مات عليها فهو ممن استقام۔ ”بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، مگر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے۔ ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اسی عقیدے پر جما رہا۔“ (ابن جریر، نسائی، ابن ابی حاتم)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: لم يشركوا بالله شيئاً، لم يلتفتوا الى اله غيرہ۔ ”پھر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا، اس کے سوا کسی دوسرے معبود کی طرف توجہ نہ کی۔“ (ابن جریر)
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا: ”خدا کی قسم! استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے، لومڑیوں کی طرح ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑتے نہ پھرے۔“ (ابن جریر)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کر لیا۔“ (کشاف)
حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اللہ کے عائد کردہ فرائض فرماں برداری کے ساتھ ادا کرتے رہے۔“ (کشاف)

تُوْعَدُونَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ

وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دُنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی،

۳۴ - فرشتوں کا یہ نُزول ضروری نہیں ہے کہ کسی محسوس صورت میں ہو اور اہل ایمان انہیں آنکھوں سے دیکھیں یا ان کی آواز کانوں سے سُنیں۔ اگرچہ اللہ جَلَّ شَانُهُ جس کے لیے چاہے فرشتوں کو علانیہ بھی بھیج دیتا ہے، لیکن بالعموم اہل ایمان پر، خصوصاً سخت وقتوں میں جب کہ دشمنانِ حق کے ہاتھوں وہ بہت تنگ ہو رہے ہوں، اُن کا نُزول غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے، اور اُن کی باتیں کان کے پردوں سے ٹکرانے کے بجائے دل کی گہرائیوں میں سکینت و اطمینانِ قلب بن کر اُترتی ہیں۔ بعض مفسرین نے فرشتوں کے اس نُزول کو موت کے وقت، یا قبر، یا میدانِ حشر کے لیے مخصوص سمجھا ہے۔ لیکن اگر اُن حالات پر غور کیا جائے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، تو اس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ یہاں اس معاملے کو بیان کرنے کا اصل مقصد اس زندگی میں دینِ حق کی سر بلندی کے لیے جانیں لڑانے والوں پر فرشتوں کے نُزول کا ذکر کرنا ہے، تاکہ انہیں تسکین حاصل ہو، اور ان کی ہمت بندھے، اور ان کے دل اس احساس سے مطمئن ہو جائیں کہ وہ بے یار و مددگار نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے فرشتے ان کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ فرشتے موت کے وقت بھی اہل ایمان کا استقبال کرنے آتے ہیں، اور قبر (عالمِ برزخ) میں بھی وہ ان کی پذیرائی کرتے ہیں، اور جس روز قیامت قائم ہوگی اُس روز بھی ابتدائے حشر سے جنت میں پہنچنے تک وہ برابر اُن کے ساتھ لگے رہیں گے، لیکن اُن کی یہ معیت اسی عالم کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس دنیا میں بھی وہ جاری ہے۔ سلسلہ کلام صاف بتا رہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں جس طرح باطل پرستوں کے ساتھی شیاطین و اشرار ہوتے ہیں، اُسی طرح اہل ایمان کے ساتھی فرشتے ہوا کرتے ہیں۔ ایک طرف باطل پرستوں کو اُن کے ساتھی اُن کے کرتوت خوش نما بنا کر دکھاتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ حق کو نینچا دکھانے کے لیے جو ظلم و ستم اور بے ایمانیاں تم کر رہے ہو، یہی تمہاری کامیابی کے ذرائع ہیں اور انھی سے دنیا میں تمہاری سرداری محفوظ رہے گی۔ دوسری طرف حق پرستوں کے پاس اللہ کے فرشتے آ کر وہ پیغام دیتے ہیں جو آگے کے فقروں میں ارشاد ہو رہا ہے۔

۳۵ - یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جو دنیا سے لے کر آخرت تک ہر مرحلے میں اہل ایمان کے لیے تسکین کا ایک نیا مضمون اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں فرشتوں کی اس تلقین کا مطلب یہ ہے کہ باطل کی طاقتیں خواہ کتنی ہی بالا دست اور چیرہ دست ہوں، اُن سے ہرگز خوف زدہ نہ ہو، اور حق پرستی کی وجہ سے جو تکلیفیں اور محرومیاں بھی تمہیں سہنی پڑیں، ان پر کوئی رنج نہ کرو، کیونکہ آگے تمہارے لیے وہ کچھ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہی کلمات جب موت کے وقت فرشتے کہتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو وہاں تمہارے لیے کسی خوف کا مقام نہیں ہے، کیونکہ وہاں جنت تمہاری منتظر ہے، اور دنیا میں جن کو تم چھوڑ کر جا رہے ہو اُن کے لیے تمہیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہاں ہم تمہارے ولی و رفیق ہیں۔ عالمِ برزخ اور میدانِ حشر میں جب فرشتے یہی کلمات کہیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں تمہارے لیے چین ہی چین ہے، دنیا کی زندگی میں جو حالات تم پر گزرے ان کا غم نہ کرو، اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُىٰ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾
 نَزْلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا
 اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ اِنِّىۤ اِنِّىۤ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَا
 تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۗ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ
 فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿٣٤﴾

وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا، اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ ہے
 سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔“

اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک
 عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔

اور اے نبی! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم
 دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت

والا ہے اس کا خوف نہ کھاؤ، اس لیے کہ ہم تمہیں اُس جنت کی بشارت دے رہے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

۳۶ - اہل ایمان کو تسکین دینے اور ان کی ہمت بندھانے کے بعد اب اُن کو اُن کے اصل کام کی طرف رغبت
 دلانی جارہی ہے۔ گزشتہ آیت میں اُن کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد
 پھر اُس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے۔ اب ان کو بتایا
 جا رہا ہے کہ آگے کا درجہ، جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی
 بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا
 ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں
 یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا، اُسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا
 اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے، جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر جس
 نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی، اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا
 ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن

کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خَلقِ خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علم برداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

۳۷ - اس ارشاد کی پوری معنویت سمجھنے کے لیے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہئیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپ کے واسطے سے آپ کے پیروؤں کو، یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ دعوتِ حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا، جس میں اخلاق، انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ ہر جھوٹ حضور اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپ کو بدنام کرنے اور آپ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپ پر چسپاں کیے جا رہے تھے، اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، جن سے تنگ آ کر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپ کی تبلیغ کو روک دینے کے لیے پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ ہلڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپ کی تاک میں لگا رہے، اور جب آپ دعوتِ حق کے لیے زبان کھولیں، اتنا شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپ کی بات نہ سن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ اُس وقت مخالفتوں کے توڑنے کا یہ نسخہ حضور کو بتایا گیا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اُٹھالائے ہوں، جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اس کا بھٹا بٹھا دیتی ہے۔ کیونکہ انسان جب تک انسان ہے، اُس کی فطرت بدی سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اُس کے علم بردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لیے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں اُن کا وقار پیدا کرنا تو درکنار، انھیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اُن کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے، جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے، مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخر کار وہ غالب آ کر رہتی ہے۔ کیونکہ اول تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروفِ پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، ایسی حالت میں تو ایک مدت کی کش مکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اُس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو تو یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

وَمَا يُكْفِّرُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَ مَا يُكْفِّرُهَا إِلَّا ذُو حِطِّ
عَظِيمٍ ۝۳۵ وَإِذَا يَنْزَعُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ط

نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو،

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخر کار جگری دوست بن جائے گا۔ اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ ایک نیکی ہوگی، مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا، اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لیے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جائیں، تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے۔ لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچالیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا، کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس قاعدہ کلمیہ کو اس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دنیا میں ایسے خبیث انفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور ان کی بُرائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عُقْرَب کا زہر یلا پین ڈرہ برابر بھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن اس طرح کے شرِّ مجسم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیر مجسم انسان کم یاب ہیں۔

۳۸ - یعنی یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ اس کے لیے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوتِ برداشت، اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں، وہاں بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا، اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا، کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سر بلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح سے اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو، اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اُسے اُس کے مقامِ بلند سے نیچے اتار لانے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔

۳۹ - یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان ان صفات سے مُتَّصِف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو، اُسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجے کے

لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں اور رکیک حرکتوں سے اُس کو شکست دے دیں۔

۴۰ - شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ، اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لیے لڑنے والوں، اور خصوصاً اُن کے سربرآوردہ لوگوں، اور سب سے بڑھ کر اُن کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کرادے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جاسکے کہ دیکھیے صاحب! بُرائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی کچھ بہت اُونچے درجے کے انسان نہیں ہیں، فلاں رکیک حرکت تو آخر انہوں نے بھی کی ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں۔ وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالفین ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راست بازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اُس وقت تک وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں ان کی طرف سے کوئی بے جا حرکت، یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی حرکت سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بڑی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو اُن کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنے رہو۔ وہ بڑا درد مند و خیر خواہ بن کر تمہیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے، اور اس حملے کے جواب میں تو لڑ جانا چاہیے، ورنہ تمہیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمہیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ کہ یہ شیطان کی اُکساہٹ ہے جو غصہ دلا کر تم سے کوئی غلطی کرانا چاہتا ہے۔ اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمد نے اپنی مُسند میں حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ حضرت ابو بکرؓ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیاں سنتے رہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آخر کار جناب صدیقؓ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے بھی جواب میں اسے ایک سخت بات کہہ دی۔ اُن کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضورؐ پر شدید انقباض طاری ہوا جو چہرہ مبارک پر نمایاں ہونے لگا اور آپؐ فوراً اُٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکرؓ بھی اُٹھ کر آپؐ کے پیچھے ہو لیے اور راستے میں عرض کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، وہ مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپؐ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اسے جواب دیا تو آپؐ ناراض ہو گئے؟ فرمایا: ”جب تک تم خاموش تھے، ایک فرشتہ تمہارے ساتھ رہا اور تمہاری طرف سے اس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آ گیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔“

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۶﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ
وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۳۷﴾

وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔^{۳۱}

اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔^{۳۳} سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو،
بلکہ اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے، اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔^{۳۴}

۳۱ - مخالفتوں کے طوفان میں اللہ کی پناہ مانگ لینے کے بعد جو چیز مومن کے دل میں صبر و سکون اور اطمینان
کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے، وہ یہی یقین ہے کہ اللہ بے خبر نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے بھی وہ جانتا ہے، اور جو کچھ
ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ ہماری اور ہمارے مخالفین کی ساری باتیں وہ سُن رہا ہے، اور
دونوں کا طرزِ عمل جیسا کچھ بھی ہے اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ اسی اعتماد پر بندہ مومن اپنا اور دشمنانِ حق کا معاملہ اللہ کے سپرد کر
کے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

یہ پانچواں موقع ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے اہل ایمان کو دعوتِ دین اور اصلاحِ خلق کی
یہ حکمت سکھائی گئی ہے۔ اس سے پہلے کے چار مقامات کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الأعراف، حواشی ۱۳۹ تا
۱۵۳، النحل، ۱۲۲-۱۲۳۔ جلد سوم، المؤمنون، حواشی ۸۹-۹۰، العنکبوت، حواشی ۸۱-۸۲۔

۳۲ - اب رُوئے سُخْنِ عوام الناس کی طرف مڑ رہا ہے اور چند فقرے ان کو حقیقت سمجھانے کے لیے ارشاد ہو
رہے ہیں۔

۳۳ - یعنی یہ اللہ کے مظاہر نہیں ہیں کہ تم یہ سمجھتے ہوئے ان کی عبادت کرنے لگو کہ اللہ ان کی شکل میں خود اپنے
آپ کو ظاہر کر رہا ہے، بلکہ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں، جن پر غور کرنے سے تم کائنات کی اور اس کے نظام کی حقیقت سمجھ سکتے ہو
اور یہ جان سکتے ہو کہ انبیاء علیہم السلام جس توحیدِ خداوندی کی تعلیم دے رہے ہیں وہی امرِ واقعی ہے۔ سورج اور چاند سے
پہلے رات اور دن کا ذکر اس امر پر متنبہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ رات کو سورج کا چھپنا اور چاند کا نکل آنا، اور دن کو چاند
کا چھپنا اور سورج کا نمودار ہو جانا صاف طور پر یہ دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی خدا یا خدا کا مظہر نہیں ہے،
بلکہ دونوں ہی مجبور و لاچار بندے ہیں جو خدا کے قانون میں بندھے ہوئے گردش کر رہے ہیں۔

۳۴ - یہ جواب ہے اُس فلسفے کا جو شرک کو معقول ثابت کرنے کے لیے کچھ زیادہ ذہین قسم کے مشرکین عموماً بگھارا
کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو سجدہ نہیں کرتے، بلکہ ان کے واسطے سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس کا جواب

فَإِنْ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ
 وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأُونَ ﴿۳۸﴾ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْتَ تَرَى الْأَرْضَ
 خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ^ط إِنَّ
 الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتِ ^ط إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۹﴾

السجدة ۱۱

لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آ کر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں، جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں، وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے۔^{۳۶}

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سُونی پڑی ہوئی ہے، پھر جو نہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے، وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔^{۳۷} یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ دیا گیا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ ہی کے عبادت گزار ہو تو ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے، براہِ راست خود اسی کو سجدہ کیوں نہیں کرتے۔

۳۵ - ”غرور میں آ کر“ سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ تمہاری بات مان لینے میں اپنی ذلت سمجھ کر اسی جہالت پر اصرار کیے چلے جائیں جس میں یہ مبتلا ہیں۔

۳۶ - مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام، جو ان فرشتوں کے ذریعے سے چل رہا ہے، اللہ کی توحید اور اسی کی بندگی میں رواں دواں ہے، اور اس نظام کے منتظم فرشتے ہر آن یہ شہادت دے رہے ہیں کہ ان کا رب اس سے پاک اور منزہ ہے کہ کوئی خداوندی اور معبودیت میں اس کا شریک ہو۔ اب اگر چند احمق سمجھانے پر نہیں مانتے اور ساری کائنات جس راستے پر چل رہی ہے اس سے منہ موڑ کر شرک ہی کی راہ چلنے پر اصرار کیے جاتے ہیں، تو پڑا رہنے دوان کو اپنی اس حماقت میں۔

اس مقام کے متعلق یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ یہاں سجدہ لازم آتا ہے، مگر اس امر میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے کہ اوپر کی دونوں آیتوں میں سے کس پر سجدہ کرنا چاہیے۔ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ان کُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ پر سجدہ کرتے تھے۔ اسی قول کو امام مالک نے اختیار کیا ہے، اور ایک قول امام شافعی سے بھی اسی کی تائید میں منقول ہے۔ لیکن حضرات ابن عباس، ابن عمر، سعید بن المسیب، مسروق، قتادہ، حسن بصری، ابو عبد الرحمن السلمی، ابن سیرین، ابراہیم نخعی اور متعدد دوسرے اکابر وہم لا یسئوون پر سجدے کے قائل ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہ کا قول بھی ہے اور شافعیوں کے ہاں بھی مرنح قول یہی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا
 أَفَمَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ خَيْرًا أَمْ مَنْ يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ
 اعْبُدُوا مَا شِئْتُمْ ۗ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۴۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ
 كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۚ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ﴿۴۱﴾

جولوگ ہماری آیات کو اُلٹے لئے معنی پہناتے ہیں، وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے، یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو، تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے،

۴۷ - تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۵۳۔ جلد سوم، الحج، حواشی ۸-۹، الروم، حاشیہ ۲۸۔ جلد چہارم، فاطر، حاشیہ ۱۹۔

۴۸ - عوام الناس کو چند فقروں میں یہ سمجھانے کے بعد کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس توحید اور آخرت کے عقیدے کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہی معقول ہے اور آثارِ کائنات اسی کے حق ہونے کی شہادت دے رہے ہیں، اب رُوئے سخن پھر ان مخالفین کی طرف مڑتا ہے جو پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ مخالفت پر اُٹلے ہوئے تھے۔

۴۹ - اصل الفاظ ہیں: يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا (ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں۔) الحاد کے معنی ہیں: انحراف، سیدھی راہ سے ٹیڑھی راہ کی طرف مڑ جانا، کج روی اختیار کرنا۔ اللہ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکلنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنی اُن کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہے۔ کفار مکہ قرآن مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات کو سُن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر، کسی آیت میں لفظی تحریف کر کے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنی پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو! آج ان نبی صاحب نے کیا کہہ دیا ہے۔

۵۰ - ان الفاظ میں ایک سخت دھمکی مضمحل ہے۔ حاکم ذی اقتدار کا یہ کہنا کہ فلاں شخص جو حرکتیں کر رہا ہے وہ مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں، آپ سے آپ یہ معنی اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ بچ کر نہیں جاسکتا۔

۵۱ - یعنی اُلٹ ہے۔ اس کو اُن چالوں سے شکست نہیں دی جاسکتی جو باطل پرست لوگ اس کے خلاف چل رہے

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ
حَكِيمٍ حَبِيدٍ ۝۵۲ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ
قَبْلِكَ ۖ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ۝۵۳ وَ لَوْ
جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَبِيًّا لَقَالُوا لَوْ لَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ

باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔
اے نبی! تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے
پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا
ہے، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔

اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے: ”کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟“

ہیں۔ اس میں صداقت کا زور ہے، علم حق کا زور ہے، دلیل و حجت کا زور ہے، زبان اور بیان کا زور ہے، بھیجنے والے
خدا کی خدائی کا زور ہے، اور پیش کرنے والے رسول کی شخصیت کا زور ہے۔ جھوٹ اور کھوکھلے پروپیگنڈے کے
تھیاریوں سے کوئی اسے زک دینا چاہے تو کیسے دے سکتا ہے۔

۵۲ - سامنے سے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہ راست حملہ کر کے اگر کوئی شخص اُس کی کسی بات
کو غلط اور کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے سے نہ آ سکنے کا مطلب یہ ہے کہ
کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم ایسا نہیں آ سکتا
جو فی الواقع ”علم“ ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجربہ اور مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت
کردے کہ قرآن نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور سیاستِ مُدُن کے باب میں
انسان کو جو رہنمائی دی ہے وہ غلط ہے۔ اس کتاب نے جس چیز کو حق کہہ دیا ہے وہ کبھی باطل ثابت نہیں ہو سکتی، اور جسے
باطل کہہ دیا ہے وہ کبھی حق ثابت نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ باطل خواہ سامنے سے آ کر حملہ
آور ہو یا ہیر پھیر کے راستوں سے چھاپے مارے، بہر حال کسی طرح بھی وہ اُس دعوت کو شکست نہیں دے سکتا جسے لے
کر قرآن آیا ہے۔ تمام مخالفتوں اور مخالفین کی ساری خفیہ اور علانیہ چالوں کے علی الرغم یہ دعوت پھیل کر رہے گی اور کوئی
اسے زک نہیں دے سکے گا۔

۵۳ - یعنی یہ اُس کا حلم اور غفور و درگزر ہی ہے کہ اس کے رسولوں کو جھٹلایا گیا، گالیاں دی گئیں، اذیتیں
پہنچائی گئیں، اور پھر بھی وہ سال ہا سال تک مخالفین کو مہلت دیتا چلا گیا۔

عَٰعَجَبِيَّ وَعَرَبِيَّ ط قُلْ هُوَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدٰى وَّشِفَآءٌ ط
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِىْ اٰذَانِهِمْ وَقُرْءٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمٰى ط اُولٰٓئِكَ
يُنَادُوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝۵۴ وَّلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسٰى الْكِتٰبَ
فَاخْتَلَفَ فِيْهِ ط وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی۔ "ان سے کہو: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو۔ اس سے پہلے ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف ہوا تھا۔ اگر تیرے رب نے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر دی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے

۵۴ - یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے، وہ اگر عربی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ کلام انھوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ ان پر خدا نے نازل کیا ہے۔ ان کے اس کلام کو خدا کا نازل کیا ہوا کلام تو اس وقت مانا جاسکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکا یک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رومی یا یونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب ان کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے، جسے یہ سمجھ سکیں تو ان کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعے سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا۔ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے۔ عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے نہ قوم۔

۵۵ - دُور سے جب کسی کو پکارا جاتا ہے تو اس کے کان میں ایک آواز تو پڑتی ہے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسی بے نظیر تشبیہ ہے جس سے ہٹ دھرم مخالفین کے نفسیات کی پوری تصویرنگاہوں کے سامنے کھینچ جاتی ہے۔ فطری بات ہے کہ جو شخص کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہوتا اُس سے اگر آپ گفتگو کریں تو وہ اسے سنتا ہے، سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اور معقول بات ہوتی ہے تو کھلے دل سے اس کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آپ کے خلاف نہ صرف تعصب بلکہ عناد اور بغض رکھتا ہو، اس کو آپ اپنی بات سمجھانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ سرے سے اُس کی طرف توجہ ہی نہ کرے گا۔ آپ کی ساری بات سُن کر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے گا کہ آپ اتنی دیر تک کیا کہتے رہے ہیں۔ اور آپ کو بھی یوں محسوس ہوگا کہ جیسے آپ کی آواز اس کے کان کے پردوں سے اُچٹ کر باہر ہی باہر گزرتی رہی ہے، دل اور دماغ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں پاسکی۔

۵۶ - یعنی کچھ لوگوں نے اسے مانا تھا اور کچھ مخالفت پر تُل گئے تھے۔

بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ﴿٣٥﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٣٦﴾

درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس کی طرف سے سخت اضطراب انگیز
شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال
اُسی پر ہوگا، اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔

۵۷ - اس ارشاد کے دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر دیا ہوتا کہ لوگوں کو
سوچنے سمجھنے کے لیے کافی مہلت دی جائے گی تو اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ دوسرا مفہوم یہ
ہے کہ اگر اللہ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر لیا ہوتا کہ اختلافات کا آخری فیصلہ قیامت کے روز کیا جائے گا تو دنیا ہی میں
حقیقت کو بے نقاب کر دیا جاتا اور یہ بات کھول دی جاتی کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔

۵۸ - اس مختصر سے فقرے میں کفار مکہ کے مرض کی پوری تشخیص کر دی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ
قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، اور اس شک نے ان کو سخت خَلْجَان و اضطراب میں
بتلا کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ بڑے زور شور سے قرآن کے کلام الہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے
رسول ہونے کا انکار کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کا یہ انکار کسی یقین کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ ان کے دلوں میں شدید تذبذب
برپا ہے۔ ایک طرف ان کے ذاتی مفاد، ان کے نفس کی خواہشات، اور ان کے جاہلانہ تعصبات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ قرآن
اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائیں اور پوری طاقت کے ساتھ ان کی مخالفت کریں۔ دوسری طرف ان کے دل اندر سے پکارتے
ہیں کہ یہ قرآن فی الواقع ایک بے مثل کلام ہے، جس کے مانند کوئی کلام کسی ادیب یا شاعر سے کبھی نہیں سنا گیا ہے، نہ کوئی
مجنون دیوانگی کے عالم میں ایسی باتیں کر سکتا ہے، نہ کبھی شیاطین اس غرض کے لیے آسکتے ہیں کہ لوگوں کو خدا پرستی اور نیکی و
پاکیزگی کی تعلیم دیں۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وہ جھوٹا کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ خدا کے بندو! کچھ
شرم کرو، کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟ جب وہ ان کو مجنون کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے پکارتا ہے کہ ظالمو! کیا واقعی تم اس شخص
کو دیوانہ سمجھتے ہو؟ جب وہ ان پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ حق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بڑائی کے لیے
کر رہے ہیں، تو ان کا دل اندر سے ملامت کرتا ہے کہ لعنت ہے تم پر، اس نیک نفس انسان کو بندہ غرض کہتے ہو جسے کبھی تم نے
دولت اور اقتدار اور نام و نمود کے لیے دوڑ دھوپ کرتے نہیں دیکھا ہے، جس کی ساری زندگی مفاد پرستی کے ہر شاہے سے پاک
رہی ہے، جس نے ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے لیے کام کیا ہے، مگر کبھی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے کوئی بے جا کام نہیں کیا۔

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۖ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ شَرَاتٍ مِّنْ

أَكْمَامِهَا ۖ وَمَا تَحِلُّ مِنْ أَنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْبِهِ ۖ
وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي ۗ قَالُوا أَدْنَبْنَا ۗ مَا مِنَّا مِنْ

اُس ساعت کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے، وہی اُن سارے پھلوں کو جانتا ہے جو اپنے شگوفوں میں سے نکلتے ہیں، اسی کو معلوم ہے کہ کون سی مادہ حاملہ ہوئی ہے اور کس نے بچہ جنا ہے۔ پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے: ”ہم عرض کر چکے ہیں، آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی

۵۹ - یعنی تیرا رب کبھی یہ ظلم نہیں کر سکتا کہ نیک انسان کی نیکی ضائع کر دے اور بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ نہ دے۔

۶۰ - اُس ساعت سے مراد قیامت ہے، یعنی وہ گھڑی جب بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ دیا جائے گا اور اُن نیک انسانوں کی دادرسی کی جائے گی جن کے ساتھ بدی کی گئی ہے۔

۶۱ - یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ گھڑی کب آئے گی۔ یہ جواب ہے کفار کے اس سوال کا کہ ہم پر بدی کا وبال پڑنے کی جو دھمکی دی جا رہی ہے وہ آخر کب پوری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سوال کو نقل کیے بغیر اُس کا جواب دیا ہے۔

۶۲ - اس ارشاد سے سامعین کو دو باتوں کا احساس دلایا گیا ہے: ایک، یہ کہ صرف ایک قیامت ہی نہیں بلکہ تمام اُمورِ غیب کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے، کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔ دوسرے، یہ کہ جو خدا جزئیات کا اتنا تفصیلی علم رکھتا ہے اُس کی نگاہ سے کسی شخص کے اعمال و افعال کا چوک جانا ممکن نہیں ہے، لہذا کسی کو بھی اُس کی خدائی میں بے خوف ہو کر من مانی نہیں کرنی چاہیے۔ اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے اس فقرے کا تعلق بعد کے فقروں سے جڑتا ہے۔ اس ارشاد کے معاً بعد جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس پر غور کیجیے تو ترتیب کلام سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا نظر آئے گا کہ قیامت کے آنے کی تاریخ معلوم کرنے کی فکر میں کہاں پڑے ہو، فکر اس بات کی کرو کہ جب وہ آئے گی تو اپنی ان گراہیوں کا تمہیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہی بات ہے جو ایک موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی تاریخ پوچھنے والے ایک شخص سے فرمائی تھی۔ صحاح اور سنن اور مسانید میں حدیث تو اتر کو پہنچی ہوئی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور سفر میں کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک شخص نے دُور سے پکارا: ”یا محمد!“ آپ نے فرمایا: ”بولو کیا کہنا ہے؟“ اس نے کہا: ”قیامت کب آئے گی؟“ آپ نے جواب دیا: ”ويحك انها كائنة لامحالة فما اعددت لها؟“ ”بندۂ خدا! وہ تو بہر حال آئی ہی ہے۔ تُو نے اس کے لیے کیا تیاری کی؟“

شَهِيدٍ ۲۷) وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ وَظُنُّوا مَا لَهُمْ مِنَ
 مَّحِيصٍ ۲۸) لَا يَسْمَعُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيُوسِسْ
 قُتُوْطٌ ۲۹) وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرِّ آءٍ مَسَّتهُ لَيَقُولَنَّ
 هَذَا لِي أُؤْتِنُ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۗ وَلَئِنْ رُجِعْتُ إِلَىٰ رَبِّي إِنَّ لِي
 عِنْدَهُ لَلْحُسْنَىٰ ۗ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا عَمِلُوا ۗ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ

دینے والا نہیں ہے۔“ اُس وقت وہ سارے معبودان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے، اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا، اور جب کوئی آفت اس پر آ جاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے، مگر جوں ہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں، یہ کہتا ہے کہ ”میں اسی کا مستحق ہوں، اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی، لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا۔“ حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں، اور انہیں ہم

۶۳ - یعنی اب ہم پر حقیقت کھل چکی ہے اور ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ جو کچھ ہم سمجھے بیٹھے تھے وہ سراسر غلط تھا۔ اب ہمارے درمیان کوئی ایک شخص بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ خدائی میں کوئی دوسرا بھی آپ کا شریک ہے۔ ”ہم عرض کر چکے ہیں“ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت کے روز بار بار ہر مرحلے میں کفار سے کہا جائے گا کہ دنیا میں تم خدا کے رسولوں کا کہا ماننے سے انکار کرتے رہے، اب بولو حق پر وہ تھے یا تم؟ اور ہر موقع پر کفار اس بات کا اعتراف کرتے چلے جائیں گے کہ واقعی حق وہی تھا جو انہوں نے بتایا تھا، اور غلطی ہماری تھی کہ اُس علم کو چھوڑ کر اپنی جہالتوں پر اصرار کرتے رہے۔

۶۴ - یعنی مایوسی کے عالم میں یہ لوگ ہر طرف نظر دوڑائیں گے کہ عمر بھر جن کی سیوا کرتے رہے، شاید ان میں سے کوئی مدد کو آئے اور ہمیں خدا کے عذاب سے چھڑالے، یا کم از کم ہماری سزا ہی کم کر دے، مگر کسی طرف کوئی مددگار بھی ان کو نظر نہ آئے گا۔

۶۵ - بھلائی سے مراد ہے خوشحالی، کشادہ رزق، تندرستی، بال بچوں کی خیر وغیرہ۔ اور انسان سے مراد یہاں نوع انسانی کا ہر فرد نہیں ہے، کیونکہ اس میں تو انبیا اور صلحا بھی آجاتے ہیں، جو اس صفت سے مُبرّا ہیں جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ بلکہ اس مقام پر

مِنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۵۰ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ
وَنَابِجَانِبِهِ ۚ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ۵۱ قُلْ
أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ
هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۵۲ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ

بڑے گندے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے۔ اور جب اسے کوئی
آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

اے نبی! ان سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے
ہوا اور تم اس کا انکار کرتے رہے، تو اُس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہوگا جو اس کی
مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو؟

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک

وہ چھپھورا اور کم ظرف انسان مراد ہے جو بُرا وقت آنے پر گڑگڑانے لگتا ہے، اور دنیا کا عیش پاتے ہی آپے سے باہر
ہو جاتا ہے۔ چونکہ نوع انسانی کی اکثریت اسی کمزوری میں مبتلا ہے، اس لیے اسے انسان کی کمزوری قرار دیا گیا ہے۔

۶۶ - یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنی اہلیت کی بنا پر ملا ہے اور میرا حق یہی ہے کہ میں یہ کچھ پاؤں۔

۶۷ - یعنی ہماری اطاعت و بندگی سے منہ موڑتا ہے اور ہمارے آگے جھکنے کو اپنی توہین سمجھنے لگتا ہے۔

۶۸ - اس مضمون کی متعدد آیات اس سے پہلے قرآن مجید میں گزر چکی ہیں۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے

لیے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد دوم، یونس، حاشیہ ۱۵، ہود، حاشیہ ۱۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔
جلد سوم، الروم، حواشی ۵۲ تا ۵۶۔ جلد چہارم، الزمر، آیات ۸-۹-۴۹۔

۶۹ - اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض اس خطرے کی بنا پر ایمان لے آؤ کہ اگر کہیں یہ قرآن خدا ہی کی

طرف سے ہوا تو انکار کر کے ہماری شامت نہ آجائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سرسری طور پر

بے سوچے سمجھے تم انکار کر رہے ہو، اور بات کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے کانوں میں انگلیاں

ٹھونسنے لیتے ہو، اور خواہ مخواہ کی ضد میں آ کر مخالفت پر تمل گئے ہو، یہ کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہے۔ تم یہ

دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ تمہیں اس قرآن کے خدا کی طرف سے نہ ہونے کا علم ہو گیا ہے اور تم یقین کے ساتھ

يَتَّبِعْنَ لَهُمْ اللَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوْلَمَ يُكْفِرُ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا

یہ جان چکے ہو کہ خدا نے اسے نہیں بھیجا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے کلام الہی ماننے سے تمہارا انکار علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان کی بنا پر ہے، جس کا صحیح ہونا اگر بادی النظر میں ممکن ہے تو غلط ہونا بھی ممکن ہے۔ اب ذرا ان دونوں قسم کے امکانات کا جائزہ لے کر دیکھ لو۔ تمہارا گمان فرض کرو کہ صحیح نکلا تو تمہارے اپنے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ بس یہی ہوگا کہ ماننے والے اور نہ ماننے والے، دونوں یکساں رہیں گے، کیونکہ دونوں ہی کو مر کر مٹی میں مل جانا ہے، اور آگے کوئی زندگی نہیں ہے جس میں کفر و ایمان کے کچھ نتائج نکلنے والے ہوں۔ لیکن اگر فی الواقع یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور وہ سب کچھ پیش آ گیا جس کی یہ خبر دے رہا ہے، پھر بتاؤ کہ اس کا انکار کر کے اور اس کی مخالفت میں اتنی دُور جا کر تم کس انجام سے دوچار ہو گے؟ اس لیے تمہارا اپنا مفاد یہ تقاضا کرتا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ اس قرآن پر غور کرو۔ اور غور کرنے کے بعد بھی تم ایمان نہ لانے ہی کا فیصلہ کرتے ہو تو نہ لاؤ، مگر مخالفت پر کمر بستہ ہو کر اس حد تک آگے تو نہ بڑھ جاؤ کہ جھوٹ اور مکرو تلبیس اور ظلم و ستم کے ہتھیار اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے استعمال کرنے لگو، اور خود ایمان نہ لانے پر اکتفا نہ کر کے دوسروں کو بھی ایمان لانے سے روکتے پھرو۔

۷۰ - اس آیت کے دو مفہوم ہیں اور دونوں ہی اکابر مفسرین نے بیان کیے ہیں:

ایک مفہوم یہ ہے کہ عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے ممالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اُس وقت انہیں پتا چل جائے گا کہ جو کچھ آج ان سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں دے رہے ہیں، وہ سراسر حق تھا۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آ جانا اور بڑے بڑے علاقے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیرو بھی ملک پر ملک فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو پورے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں جو حیرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں، وہ محض اس معنی میں اللہ کی نشانیاں نہ تھیں کہ اہل ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اس معنی میں تھیں کہ یہ فتح ممالک دنیا کی دوسری فتوحات کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے جلو میں ایک عظیم الشان مذہبی، اخلاقی، ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب لے کر آئی تھی، جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسان کے بہترین جوہر کھلتے چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدنیا درویشوں اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے اندر ہی دیکھنے کی امید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبار دنیا چلانے والوں میں بھی وہ پائے جاسکتے ہیں، اس انقلاب نے وہ فضائل اخلاق فرماں رواؤں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کی عدالت میں، فوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں، ٹیکس وصول کرنے والوں کی تحصیل داری میں، اور بڑے بڑے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ معاشرے میں عام انسانوں کو اخلاق اور کردار اور طہارت و نظافت کے اعتبار سے اتنا اونچا اٹھایا کہ دوسرے

معاشروں کے چیدہ لوگ بھی ان کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اُس نے اُوہام و خرافات کے چکر سے نکال کر انسان کو علمی تحقیق اور معقول طرز فکر و عمل کی صاف شاہراہ پر ڈال دیا۔ اُس نے اجتماعی زندگی کے اُن امراض کا علاج کیا جن کے علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انہوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو سکے، مثلاً رنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے درمیان اُوچ نیچ کا امتیاز اور چھوت چھات، قانونی حقوق اور عملی معاشرت میں مساوات کا فقدان، عورتوں کی پستی اور بنیادی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حکومت کا تنقید و محاسبے سے بالاتر رہنا، عوام کا بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے احترامی، جنگ میں وحشیانہ حرکات، اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب سے بڑھ کر خود عرب کی سر زمین میں اس انقلاب نے دیکھتے دیکھتے طوائف الملوکی کی جگہ نظم، خوں ریزی و بد امنی کی جگہ امن، فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و طہارت، ظلم و بے انصافی کی جگہ عدل، گندگی و ناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جہالت کی جگہ علم، اور نسل در نسل چلنے والی عداوتوں کی جگہ اخوت و محبت پیدا کر دی، اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ دیکھ سکتے تھے، انہیں دنیا کا امام بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اُسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جسے مخاطب کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اُس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانیوں کو برابر دکھائے جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زوال کے دور میں بھی اخلاق کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی گرد کو بھی وہ لوگ کبھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و شائستگی کے علم بردار بنے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقا، امریکا، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اُس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پا کر اُتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں ظالم پائے گئے ہیں اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمراں رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا، اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانہ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا، اور اب ہندو غالب آ جانے کے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ پچھلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا، اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آفاق ارض و سما میں بھی اور انسانوں کے اپنے وجود میں بھی لوگوں کو وہ نشانیاں دکھائے گا جن سے اُن پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن جو تعلیم دے رہا ہے، وہی برحق ہے۔ بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ آفاق ارض و سما اور خود اپنے وجود کو تو لوگ اُس وقت بھی دیکھ رہے تھے، پھر زمانہ مستقبل میں ان چیزوں کے اندر نشانیاں دکھانے کے کیا معنی؟ لیکن یہ اعتراض بھی ویسا ہی سطحی ہے جیسا اوپر کے مفہوم پر اعتراض سطحی تھا۔ آفاق ارض و سما تو بے شک وہی ہیں جنہیں انسان ہمیشہ سے دیکھتا رہا ہے، اور انسان کا اپنا وجود بھی اُسی طرح کا ہے جیسا ہر زمانے میں دیکھا جاتا رہا ہے، مگر ان چیزوں کے اندر خدا کی نشانیاں اس قدر بے شمار ہیں کہ انسان کبھی ان کا احاطہ نہیں کر سکا ہے، نہ کبھی کر سکے گا۔ ہر دور میں انسان کے سامنے نئی نئی نشانیاں آتی چلی گئی ہیں اور قیامت تک آتی چلی جائیں گی۔

شَهِيدٌ ۵۲) اَلَا اِنَّهُمْ فِيْ مَرِيَّةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ اَلَا
 اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُُّحِيْطٌ ۵۳)



شاہد ہے؟ آگاہ رہو، یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سُن رکھو، وہ ہر چیز پر محیط ہے۔

۷۱ - یعنی کیا لوگوں کو انجام بد سے ڈرانے کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اس دعوتِ حق کو جھٹلانے اور زک پہنچانے کے لیے جو جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ ان کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا ہے۔

۷۲ - یعنی ان کے اس رویے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ کبھی ان کو اپنے رب کے سامنے جانا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

۷۳ - یعنی اُس کی گرفت سے بچ کر یہ کہیں جا نہیں سکتے، اور اُس کے ریکارڈ سے ان کی کوئی حرکت چھوٹ

نہیں سکتی۔